اپنا گریباں چاک: جاوید اقبال کی آپ بیتی

مشفق خواجہ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو

مشفق خواجہ، میرے نام ایک مکتوب [مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۴ء] میں لکھتے ہیں:

''میرے پچھلے خط میں اسلام آباد کے دوستوں میں ڈاکٹر انور محمود خالد کا بھی ذکر تھا۔ خالد صاحب کا ایک کام جو اردو میں سیرت النبیؐ کے حوالے سے ہے، آپ کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ یہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو اقبال اکیڈمی نے شائع کیا تھا۔ خالد صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد فیصل آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہیں اور ایک شاندار لائبریری کے مالک ہیں۔ کثرت سے کتابیں خریدتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔ دل چسپی کے موضوعات بہت وسیع ہیں، سیرت النبیؐ تو خاص موضوع ہے، لائبریری کا ایک حصہ دنیا بھر کی فلمی شخصیات سے متعلق ہے۔ جن دنوں میں اسلام آباد میں تھا، وہاں کی دوکانوں سے روزانہ کتابیں خرید کر میرے کمرے میں جمع کرتے رہتے تھے۔ ان میں تین کتابیں دلیپ کمار وغیرہ کے بارے میں تھیں جو انھوں نے خاصی مہنگی خریدی تھیں۔ کوئی کتاب ہزار روپے سے کم کی نہ تھی۔

ایک لطیفہ سنیے۔ جن دنوں میں بیمار تھا خالد صاحب نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتی ''اپنا گریباں چاک'' پر ریڈیو سے تبصرہ کیا اور مجھے بھیجا۔ میں نے اس کے جواب میں اس کتاب پر اپنے تاثرات انھیں لکھ بھیجے۔ انھوں نے میرا خط جاوید اقبال کو بھیج دیا۔ یہ دونوں چیزیں آپ کی دل چسپی کی ہیں اس لیے بھیج رہا ہوں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتی میں بعض باتیں سخت قابلِ اعتراض ہیں''۔

ذیل میں قارئین، کی خدمت میں مشفق خواجہ اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے خط پیش کیے جاتے ہیں امید ہے یہ دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔ [ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو]

۳ڈی۔۲۶/۹

ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

۱۰/مارچ ۲۰۰۴ء

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ریڈیو سے اردو آپ بیتیوں پر ایک سلسلۂ تقاریر شروع کیا ہے۔ آپ نے اردو اور انگریزی کی بے شمار آپ بیتیاں دیکھی ہیں اور اس موضوع پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ جب یہ سلسلۂ تقاریر مکمل ہوگا تو آپ نظرِ ثانی کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ نظرِ ثانی کی بات اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ریڈیو کی کچھ محدودات ہوتی ہیں، اس وجہ سے موضوع کے ساتھ اُس طرح انصاف نہیں کیا جا سکتا جس طرح کسی علمی و ادبی جریدے کے لیے مضمون لکھتے وقت سارے پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بحث کی جاتی ہے۔

آپ نے ''اپنا گریباں چاک'' پر اپنی تقریر کی جو نقل بھیجی ہے، میں اسے پڑھ کر محظوظ ہوا۔ آپ نے ریڈیو کی محدودات کا بھی خیال رکھا ہے اور موضوع کا حق ادا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تاہم اس شذرے کو تنقیدی مقالات کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کتاب کے بہت سے پہلو ایسے ہیں کہ اگر آپ ان پر بحث کرتے تو قاری کو کتاب کے عیوب و محاسن کے سمجھنے میں آسانی ہوتی۔

مجھے اس کتاب کے چھپنے کی اطلاع [شائع ہونے کی نہیں] ڈاکٹر داؤد رہبر سے ملی تھی۔ اعجاز بٹالوی[۱] کے پاس اس کا ایک قبل از اشاعت نسخہ تھا جو انھیں مصنف نے اس خیال سے دیا تھا کہ وہ اِس پر ایک نظر ڈال کر اطمینان کر لیں کہ اس میں کوئی بات قابلِ اعتراض تو نہیں۔ وہ امریکہ گئے تو کتاب ساتھ لے گئے اور واپس آتے وقت کتاب ڈاکٹر داؤد رہبر کو پیش کر دی۔ جب ڈاکٹر رہبر نے اس کے طبع ہونے کا ذکر کیا تو جی چاہا فوراً اس سے استفادہ کروں۔ لاہور ایک دوست کو فون کیا تو انھوں نے بتایا کہ چھپنے کی حد تک بات درست ہے البتہ اشاعت میں کچھ وقت لگے گا کیوں کہ تصویروں کے انتخاب کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہو گیا ہے۔ میں بڑی بے تابی سے انتظار کرتا رہا۔ جب یہ شائع ہوئی تو میں نے اسے بلا تاخیر حاصل کیا۔ آپ ہی کی طرح مجھے بھی آپ بیتیوں سے دل چسپی ہے، اور پھر یہ تو علامہ اقبال کے فرزند کی آپ بیتی تھی، اس لیے میں نے اسے بڑے اشتیاق سے پڑھا۔

بلاشبہ یہ ایک دل چسپ کتاب ہے، اپنے مواد اور اسلوبِ تحریر دونوں کے اعتبار سے۔ اس کا بنیادی وصف Readablity ہے۔ کتاب پہلے ہی صفحہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور جوں جوں کتاب آگے بڑھتی ہے یہ گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ میں نے یہ خوبی بہت کم کتابوں میں پائی ہے۔

جاوید اقبال: شب کے رفیق:

اس کتاب کی ایک خوبی ایسی بھی ہے جو اردو زبان کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ یہ کتاب صرف لفظوں ہی میں نہیں لکھی گئی، تصویروں میں بھی بیان کی گئی ہے۔مصنف نے جتنا کچھ لفظوں میں کہا ہے،اس سے کہیں زیادہ تصویروں کی زبانی بیان کر دیا ہے۔خصوصاً ان بے نام چہروں کی زبانی جو انگلستان میں مصنف کے سلسلۂ روز شب کے رفیق تھے۔ [یہاں آپ لفظ 'روز' کو غیر ضروری قرار دے کر حذف کر سکتے ہیں]۔

بے باکی کا منبع: لڑکیوں کے کالج میں شب بسری:

کتاب کا ایک نمایاں وصف مصنف کی بے باکی ہے۔'بے باکی' کے ساتھ ایک اور اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے 'حق گوئی'۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کتاب حق گوئی و بے باکی کا عمدہ نمونہ ہے کیوں کہ آپ بیتی میں حق گوئی کا منبع لکھنے والے کی ذات ہوتی ہے، اس لیے حق بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ لکھنے والا پیش کرتا ہے۔لیکن بے باکی یہ ہے کہ لکھنے والا ایسی باتیں بھی لکھ دے جو کوئی دوسرا کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جرأت کی یہ کمی عموماً اپنے آپ کو پارسا بنا کر پیش کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔یا پھر لکھنے والا معاشرتی واخلاقی دباؤ کے تحت جرأت اظہار سے محروم ہو جاتا ہے۔''اپنا گریباں چاک''ایک بے باک بلکہ بہادر انسان کی آپ بیتی ہے جو اپنے بارے میں ہر بات کہنے کی جرأت رکھتا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کیمبرج کے''ڈیرڈیول''لڑکوں نے بھی صحیح طور پر''کیمبرج مین'' کا اسٹیٹس کوالی فائی کرنے کے لیے چند قواعد بنا رکھے تھے۔مثلاً پراکٹر اور اس کے تیز رفتار بل ڈاگز کے ہاتھوں سے بچ نکلنا، رات کے دو بجے کالج کا لوہے کا گیٹ پھلانگ کر بغیر پکڑے جانے کے اپنے کمرے تک پہنچنا اور سب سے اہم لڑکیوں کے کالج کے اندر بغیر پکڑے گئے پوری رات گزارنے میں کامیاب ہونا۔اپنے پانچ سالہ کیمبرج کے قیام میں میں ان تین میں سے دو قواعد کو الی فائی کرنے میں کامیاب رہا۔وہ کون سے دو قواعد تھے؟ یہ ایک پہیلی ہے جسے کوئی بوجھے تو جانیں'' [ص ۲۷]۔

دیکھیے کتنے خوب صورت پیرائے میں مصنف نے بتا دیا کہ وہ لڑکیوں کے کالج میں بغیر گرفت میں آئے، پوری پوری راتیں گزارتے رہے ہیں۔موصوف نے''کیمبرج مین'' کا اسٹیٹس کوالی فائی کرنے کے لیے جو تین قاعدے بتائے ہیں، ان میں سے پہلے دو تو ایک ہی قاعدے کے دو اجزاء ہیں لہٰذا تین نہیں، اصل میں دو قاعدے ہی ہیں جنھیں کوالی فائی کرنے میں وہ کامیاب رہے۔

علامہ اقبالؒ کے انتقال پر جاوید اقبال کا اطمینان:

بے باکی کے اظہار کی ایک مثال وہ بھی ہے جب ڈاکٹر صاحب نے اپنے عظیم والد کے انتقال

پر اطمینان کا سانس لیا، بلکہ خوش ہوئے اور ان کی عائد کردہ پابندیوں کو توڑ کر آسودگی حاصل کی۔ لکھتے ہیں:

''والد کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہو گیا۔ جن باتوں سے انھوں نے منع کر رکھا تھا، میں نے بڑی رغبت سے ان میں سے ہر ایک کو اپنایا۔ صحیح و غلط اور نیکی و بدی میں بدی کا رستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔ اگر سرِ شام گھر میں موجود رہنے کا حکم تھا تو میں آدھی رات سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھتا۔

آنکھ میں حیاء باقی نہ رہی: کیوں

اگر سینما دیکھنا منع تھا تو ہر روز دو دو بلکہ تین تین شو دیکھتا۔ روزمرہ کے باورچی خانے کے حساب لکھتے وقت پیسوں میں گھپلا کرتا۔ رنگ برنگی ریشمی قمیصیں، مہنگے ولایتی بوٹ اور یورپی انداز کے سلے ہوئے سوٹ، نکٹائیاں، اوور کوٹ، دستانے اور فلیٹ ہیٹ زیب تن کرتا...... اُس زمانے میں مال روڈ پر کر پارام اچھی قمیصیں سینے میں مشہور تھا...... مال روڈ پر ہی لاہور کے مشہور ریسٹورنٹ اور ہوٹل واقع تھے۔ اسٹینڈرڈ، اسٹیفلز، میٹرو، فلیٹیز، نیڈوز وغیرہ بھی مے نوشی، یورپی طرز کے رقص و سرور اور رات کے کھانے کے لیے معروف جگہیں تھیں''۔ [ص ۴۷-۴۶]۔

یہ اُس جاوید اقبال کا حال ہے جس کے لیے اقبالؔ نے یہ دعا کی تھی:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

فرزند اقبال: ہوٹلوں کی مئے لالہ فام:

علامہ اقبال کی دعا قبول ہوئی مگر صرف کپڑوں کی حد تک۔ عزیز موصوف نے کیسے کیسے بے داغ لباس زیب تن کیے! انہی جاوید اقبال کو علامہ نے یہ نصیحت بھی کی تھی:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

جاوید اقبال نے اس نصیحت پر لفظاً و معناً عمل کیا۔ پہلے یہیں لاہور میں اور پھر انگلستان جا کر۔ علامہ لفظ ''عشق'' کو جن وسیع اور بلند معنوں میں استعمال کرتے ہیں، جاوید اقبال کو ان سے سروکار نہیں تھا، ان کے ہاں یہ لفظ ان معنوں مستعمل رہا جن معنوں میں حالی کے اس شعر میں آیا ہے:

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا، اُس کو بٹھا کے چھوڑا

علامہ نے انھیں یہ نصیحت بھی کی تھی:

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مے لالہ فام پیدا کر

غزل سے مے لالہ فام پیدا کرنا خاصا پیچیدہ اور مشکل کام تھا جسے مال روڈ لاہور کے ہوٹلوں نے خاصا آسان کر دکھایا۔

نیک آدمی بے وقوف ہوتا ہے: جاوید اقبال

اِن جملہ ہائے معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی والد کی وفات کے بعد فرزندِ ارجمند کی آزادہ روی کی۔ لاہور میں اور پھر انگلستان میں بھی انھیں حسن بازار سے لے کر حسنِ بزم خاص تک سے محظوظ ہونے کے مواقع ملے اور بالآخر ہر طرح کے بازاروں سے گزرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کیا:

''ایسا شخص جس نے گناہ نہ کیا ہو یا بدی کا راستہ اختیار نہ کیا ہو یا جو فرشتہ سیرت ہو، عموماً بے وقوف ہوتا ہے''۔[ص۵۰]۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی دانش مندی یا دانش وری بے بنیاد نہیں ہے۔اسی دانش مندی نے اس زمانے میں بھی جب وہ انصاف کی کرسی پر اور ہاتھوں میں انصاف کا ترازو لیے ہوئے بیٹھے تھے، اُن کو اِس قسم کے نظریات پر ثابت قدم رکھا:

''جنرل ضیاء الحق کے دور میں پی سی او کے تحت......جن جج صاحبان نے اصولاً حلف نہ اٹھایا، وہ بھی اپنی جگہ درست تھے اور جنھوں نے آمر کے حکم پر حلف اٹھالیا، وہ بھی غلط نہ تھے''[ص۲۱۶]۔

اسی کو کہتے ہیں: رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

جاوید اقبال کی رنگینی: ریش بابا بھی سلامت نہ رہی

ڈاکٹر جاوید اقبال کی بے باکی یعنی جرأتِ اظہار کے سلسلے میں ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو انگریزی تمدن میں گم ہو جانے [ص۴۷]، ہم جنس پرست لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گھومنے [ص۸۰] ساری ساری رات رقص کرنے [ص۸۲] سے متعلق ہیں۔ بے باکی کی انتہاء وہاں نظر آتی ہے جہاں وہ حسینوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کی تائید میں اپنے والد محترم کے اشعار پیش کرتے ہیں۔

مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

''لڑکیاں جو کیمبرج میں میری واقف بنیں اُن میں سے بیشتر کا تعلق مصوری، مجسمہ سازی یا ساز سنگیت ہی سے تھا۔ان میں سے بعض تو بے حد خوب صورت تھیں، گویا ہاتھ لگانے سے ان کے میلے ہو جانے کا امکان تھا۔مگر بقول علامہ اقبال:

چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روے
تپد آں زماں دلِ من پےِ خوب ترنگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے''

علامہ اقبال نے جو بات ایک وسیع تناظر میں کہی تھی، جاوید اقبال نے اسے ''نگار بازی'' تک محدود کر کے ''ریشِ بابا'' سے بھی کھیلنے کی جسارت کی ہے اور کمال یہ ہے کہ پہلے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اپنے مزاج و مذاق کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ فرماتے ہیں: ''میری نگاہ جب کسی ماہ جبیں کے حُسن پر پڑتی ہے تو اُسی لمحے میرا دل اُس سے بھی خوب تر کسی حسینہ کے لیے دیوانہ وار خواہش کرنے لگتا ہے'' [ص ۸۳، ۸۴]۔ اگر علامہ اقبال کو معلوم ہوتا کہ اُن کے خوب سے خوب تر کی تلاش کے فلسفے کو محض ہوس پرستی سمجھا جائے گا اور سمجھنے والے بھی اُن کے فرزندِ ارجمند ہوں گے تو وہ شاید شاعری ترک کر دیتے۔

اصل جمہوریت: عریانی و فحاشی کی آزادی

مینڈک کی ٹانگیں [ص ۱۲۳] اور بعد ازاں سالم مینڈک کھانے والے [ص ۱۲۹] کی بے باکی کا ایک ثبوت اُس وقت بھی ملتا ہے جب وہ بڑے خوب صورت پیرائے میں امریکی جمہوریت پر طنز کرتے ہیں:

''......ایک خاتون لفٹ میں داخل ہوئیں جنھوں نے نہایت بیش قیمت فرکوٹ [پوستین] زیب تن کر رکھا تھا۔ فرکوٹ شاید اتفاقاً یا دیدہ دانستہ طور پر سامنے سے سرک گیا۔ وہ مادرزاد برہنہ تھیں۔ صرف جوتے پہن رکھے تھے۔ میرے دل سے فوراً نکلا: اصل جمہوریت تو امریکہ ہی میں ہے'' [ص ۱۲۱]۔

باپ کا حوالہ سخت ناگوار ہے:

اسی بے باکی کا نتیجہ ہے کہ کتاب میں کئی جگہ ڈاکٹر صاحب نے اس پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ انھیں فرزندِ اقبال یعنی میوزیم پیس سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

''بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں مانا کیوں کہ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے لیے ''پدرم سلطان بود'' کی بناء پر فخر کا مقام تھا۔ زندگی میں اچھا برا اپنا مقام پیدا کیا، تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا، تو مجھے بہت برا لگا۔ یہ میری انا کی نشوونما میں مداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے، میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا، ہمیشہ چھوٹا ہی سمجھا گیا''۔ [ص ۸]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

’’مجھے علامہ اقبال کے حوالے سے میوزیم پیس کی طرح پاکستان کے اکثر حکمران بیرونی مہمان شخصیات سے متعارف کراتے رہے ہیں‘‘۔[ص۱۹۳]

ایک مرتبہ مجید نظامی نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی موجودگی میں ایک جلسے میں یہ کہا:

’’یہ حقیقت ہے کہ جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے نیز وہ علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں‘‘۔[ص۲۶۶]

اس الزام کا جواب دیتے ہوئے جاوید اقبال فرماتے ہیں:

’’مجھے علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے یا اُن کا فرزند ہونے پر غصہ نہیں، البتہ علامہ اقبال کے اُن پرستاروں پر غصہ ضرور آتا ہے جو اُن کے افکار کی نفی کرتے ہوئے مجھے صرف فرزندِ اقبال کی حیثیت سے جاننا چاہتے ہیں اور اس فریم سے میرا باہر نکلنا انھیں ناگوار گزرتا ہے۔ میں جب کبھی ملک سے باہر لیکچروں کے لیے بلوایا جاتا ہوں تو میری شناخت ’’جاوید اقبال‘‘ کے طور پر ہوتی ہے۔ مگر میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کے اندر میری حیثیت ’’فرزندِ اقبال‘‘ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ بالکل اُسی طرح ہے جب ۱۹۷۷ء میں وفاقی حکومت نے ہمارے گھر جاوید منزل کو اقبال میوزیم بنانے کی خاطر خرید لیا تو میرے دو معصوم بچوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ابو، اب ہمارا کیا بنے گا۔ میں نے انھیں کہا کہ تم دونوں کو علیحدہ علیحدہ بوتلوں میں بند کر کے یہاں سجا دیا جائے گا۔ کہنے لگے: اور آپ کہاں جائیں گے۔ میں نے جواب دیا: بیٹا میں تو پہلے ہی بوتل میں بند ہوں‘‘۔[ص۲۶۶]

جاوید اقبال: الگ شناخت پر اصرار کیوں؟

گستاخی معاف، جاوید اقبال کی شناخت ملک میں اور بیرونِ ملک یکساں ہے۔ یعنی وہ فرزندِ اقبال ہی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور انھیں زندگی میں جو کچھ ملا، وہ مالی آسودگی ہو یا عہدے، وہ اعزازی ڈگریاں ہوں یا غیر ملکی اسفار کے پے در پے مواقع، یہ ان کی ذاتی کوشش کا نہیں، فرزندِ اقبال ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، لیکن یہ ڈگریاں ہزاروں نہیں لاکھوں افراد حاصل کرتے ہیں، لیکن اُن کو وہ مرتبہ، وہ حیثیت اور وہ مقام نہیں ملتا جو جاوید اقبال کو ملا، جاوید اقبال نے علم و ادب کی دنیا میں یا کسی دوسرے فن کے حوالے سے کوئی ایسا کارنامہ بھی انجام نہیں دیا جو بے مثال ہو تو پھر اپنی الگ پہچان اور الگ شناخت پر اصرار کیوں؟

ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی کاموں میں جو کام کسی حد تک اہمیت رکھتا ہے وہ اقبال کی سوانح عمری ’’زندہ رود‘‘ ہے۔ بلاشبہ اقبالیات میں اس کا درجہ بلند ہے اور اس کے مصنف کی حیثیت سے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں بھی ان کی شناخت اقبال ہی کے حوالے سے ہوگی۔ اور

مطالب کتاب کے استناد کی وجہ بھی یہی ہو گی کہ لکھنے والا فرزند اقبال ہے۔

میں اچھا نہ بن سکا: جاوید اقبال

''اپنا گریباں چاک'' کے اختتامی حصے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''میں اپنی کوتاہیوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں نہ اچھا مصور بن سکا نہ اچھا ادیب، نہ اچھا سیاست داں نہ اچھا وکیل، نہ اچھا جج نہ اچھا شوہر، نہ اچھا باپ۔ میری زندگی میں آسودگی میری اپنی محنت کا ثمر نہیں بلکہ میری رفیقۂ حیات کی مشقت کا نتیجہ ہے''۔ [ص ۲۸۳]

اگر اس بیان کو روایتی انکسار کی بجائے ڈاکٹر صاحب کی حقیقت پسندی کا نتیجہ سمجھا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں آپ کو بہت کچھ اہلیۂ محترمہ[۲] کے ذریعے ملا ہے، وہیں شناخت کے طور پر جو دولتِ بیدار والد محترم کے حوالے سے ملی ہے اسے بھی صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی، اس نیک کام کے انجام دینے کا موقع انھیں زیرِ نظر کتاب میں ملا تھا۔ لیکن اس کتاب پر بھی جاوید اقبال سے زیادہ علامہ اقبال چھائے ہوئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کتاب کا نام بھی ان کے ایک شعر سے اخذ کیا گیا ہے اور کتاب میں جا بجا انہی کے اشعار سے فضا ہموار کی گئی ہے۔ اگر اس کتاب میں سے علامہ اقبال کو حذف کر دیا جائے تو باقی جو کچھ بچے گا وہ جاوید اقبال کی نامکمل داستانِ حیات ہو گی۔ ''اپنا گریباں چاک'' پر اقبال کا سایہ اس حد تک ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آگے چل کر یہ کتاب یونیورسٹیوں کے اقبالیات کے نصاب میں شامل ہو جائے گی۔ بعض چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں، اس اصول کے تحت اقبال کو بھی اس کتاب کے ذریعے پہچاننے میں مدد ملے گی۔

آپ بیتی: فکری نہیں بے فکری کا کام ہے

مجید نظامی کے دوسرے الزام [جاوید اقبال، علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں] کے جواب میں جاوید اقبال فرماتے ہیں:

''اب رہ گئی بات علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی، یہ تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہونی چاہیے۔ یہی ترغیب تو ہمیں علامہ اقبال دیتے ہیں۔ کسی صاحبِ فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اس کے بتائے ہوئے رستے سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے...... علامہ اقبال سے آگے بڑھنے کی سعی کو روکنے کا مطلب یہی ہو گا کہ ہم فکرِ اقبال کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور ان کے بعد کسی بھی صورت میں فکری تسلسل کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ سوچ علامہ اقبال کی تعلیمات کے برعکس ہے اور اس پر صرف ان کے نادان مریدوں کا ہی اتفاق ہو سکتا

ہے‘‘۔[ص ۶۸۔۲۶۷]

اِس بحث سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا یا آگے نکل جانا کوئی غلط بات نہیں ہے۔لیکن مجید نظامی نے الزام تراشی کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ جاوید اقبال نے کب، کہاں اور کس طرح علامہ اقبال سے آگے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور جاوید اقبال نے اس الزام کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہاتھ پاؤں مارنے کی کوئی وجہ بتائی ہے اور نہ اپنی کوشش میں کامیاب ہونے کا کوئی ثبوت دیا ہے۔کسی صاحبِ فکر سے کوئی صاحبِ فکر ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔افسوس کہ ہم جاوید اقبال کے کسی فکری کام سے بے خبر ہیں۔یہ آپ بیتی ہمارے سامنے ہے لیکن یہ کوئی فکری کام نہیں بلکہ بےفکری کا نتیجہ ہے یعنی آرام کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔اب لے دے کر ایک ہی معاملہ ایسا رہ جاتا ہے جس میں جاوید اقبال، علامہ اقبال سے آگے نکل گئے۔اقبال خواہش کے باوجود جج نہ بن سکے اور جاوید اقبال کو بلا طلب ججی مل گئی۔مگر یہاں بھی جاوید اقبال خود اقبال ہی کی وجہ سے آگے نکلے کیوں کہ اگر وہ فرزندِ اقبال نہ ہوتے تو جج بھی نہ ہوتے۔

ایک زبردست لطیفہ:

یہاں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔’’جاوید نامہ‘‘ کے مشہور مترجم رفیق خاور نے ایک مرتبہ ایک محفل میں کہا:’’میری فکر وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں علامہ اقبال کی فکر ختم ہوتی ہے‘‘۔اُن سے گزارش کی گئی: ’’آپ اپنی فکر کا کوئی ایسا نمونہ بتائیے جو علامہ اقبال کی فکر سے آگے کا ہو‘‘۔جواب دیا:’’دونوں کا کلام سامنے رکھ کر یہ نمونہ آپ خود تلاش کیجیے‘‘۔

ڈاکٹر انور محمود خالد صاحب! اب یہ تحقیق آپ کے ذمے رہی۔آپ یہ بتائیے کہ جاوید اقبال کی فکر کب، کہاں اور کیسے علامہ اقبال کی فکر سے آگے نکلی ہے۔

’’اپنا گریباں چاک‘‘ کا وہ حصہ جس میں مصنف نے عدالتی زندگی کے اپنے تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں، بے مثال ہے۔انھوں نے ہماری عدلیہ اور اس کے بعض ارکان کی جو عبرت ناک تصویر کشی کی ہے وہ ہماری قومی زندگی کے زوال کا لازوال مرقع ہے۔پچھلے پچاس برسوں میں ایسی مرقع کشی کسی صاحبِ قلم نے نہیں کی۔کاش جاوید اقبال اس داستان کو کچھ اور دراز کرتے!

آپ بیتی: زبان و بیان کی ناگوار غلطیاں

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اردو ٹھیک ٹھاک لکھی ہے، لیکن کہیں کہیں زبان و بیان کی غلطیاں ناگوار حد تک موجود ہیں۔ایک تو وہ بار بار ’برا منانا‘‘ لکھتے ہیں[مثلاً ص ۸، ص ۱۴۷] یہ کوئی تہوار نہیں ہے جو منایا جائے۔یہ ماننے کا محل ہے۔یعنی ’’برا ماننا‘‘ درست ہے۔ایک جگہ لکھا ہے:’’کوٹھی کا داخلہ لکڑی کے چھپر کھٹ والے بڑے برآمدے کے ذریعے تھا‘‘[ص ۱۵]۔معلوم نہیں مصنف کے ذہن میں چھپر کھٹ کا کیا مفہوم ہے۔

چھپر کھٹ تو اس پلنگ کو کہتے ہیں جس پر چھت اور پوشش ہو یا پھر چھتری والے دلہن کے پلنگ کو کہتے ہیں۔ایک جگہ تو غضب کر دیا ہے۔علامہ اقبال کے جنازے کے بارے میں لکھتے ہیں:''اسلامیہ کالج کی گراونڈ سے جنازہ خراماں خراماں چلتے ہوئے......''[ص ۴۲]۔اگر مصنف کو''خراماں خراماں'' کے معنی معلوم ہوتے تو وہ ایسا ہرگز نہ لکھتے۔یہ الفاظ محبوب کی خوش رفتاری اور اٹھلا کر چلنے کے لیے آتے ہیں۔ایسی ہی مضحکہ خیز مثال وہاں ملتی ہے جہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ یہاں کوئی دل لگا کر کام نہیں کرتا۔فرماتے ہیں:''یہاں کوئی بھی شخص دل لگی سے کام نہیں کرتا''[ص ۱۸۹]۔اسی طرح''من حیث الگروپ''[ص ۵۶]،'چڑھ مڑھ ترین''[ص ۷۱]جیسی تراکیب سے خوش مذاقی کا ثبوت نہیں ملتا۔''غلاف اُڑھا دیا'' کی جگہ''غلاف اوڑھ دیا''[ص ۱۴۸]۔اسی قبیل کا انداز بیان ہے۔

املا کی اغلاط بھی کثرت سے ہیں۔[کتابت یا کمپوزنگ کی غلطیوں سے مختلف]۔صوفی کی غلط جمع [صوفیاء، ص ۱۳۔صحیح: صوفیہ] سے قطع نظر اس قسم کی بوالعجبیاں بھی ملتی ہیں: برخواست [ص ۶۳] بجائے برخاست، مذاحیہ [ص ۷۵] بجائے مزاحیہ، معرکتہ الآرا [ص ۲۰۷] بجائے معرکہ آرا، دوشامبے [ص ۲۴۵] بجائے دوشنبہ، جگہ کا نام، ذق پہنچے [ص ۲۶۹] بجائے زک پہنچے۔حامی بھری [ص ۱۶۷] بجائے ہامی بھری۔

مزار اقبال پر جانے سے گریز کرتا ہوں: جاوید اقبال

اب ایک دو لطیفے بھی ملاحظہ فرمائیے۔کتاب کے آخر [ص ۲۶۶] میں لکھا ہے کہ مزارِ اقبال پر جانے سے گریز کرتا ہوں۔مگر جب موصوف نے بھٹو کے مقابلے پر الیکشن میں حصہ لیا تو سب سے پہلے مزارِ اقبال پر حاضری دی اور الیکشن میں حصہ لینے کے سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔یہ مزار پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال نے قرۃ العین حیدر کی دوستی پر فخر تو کیا ہے مگر ساتھ ہی اُنھیں یہ طعنہ بھی دیا ہے کہ وہ ہندی کلچر کو پسند کرتی ہیں۔دو جملے بڑے عجیب وغریب ساتھ ساتھ لکھے ہیں:''جوانی بغیر شادی کے گزار دی۔میری ان کے ساتھ معصومانہ بے تکلفی تھی''[ص ۹۷]۔

سمجھ نہیں آتا کہ ان دو جملوں کو ساتھ ساتھ لکھنے کا مطلب کیا ہے۔بہرحال ایک لطیفہ یاد آ گیا۔بلا تشبیہہ عرض ہے۔ایک بہت بڑے شاعر کا بیٹا ایک بہت بڑی ادیبہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔مشترک دوستوں نے ان کی ملاقات کرائی۔ملاقات کے بعد خاتون نے انکار کر دیا۔وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے کہا:''ان صاحب زادے کا تلفظ تو ان کے اباجی کے تلفظ سے بھی زیادہ خراب ہے''۔

آخری بات......ڈاکٹر جاوید اقبال نے دیباچے میں لکھا ہے:''اردو ادب میں اپنے سوانح حیات خود تحریر کرنے کا رواج نہیں ہے،اس لیے ادب کی اس صنف کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی''[ص ۵]۔جس زبان میں تین سو سے زیادہ آپ بیتیاں موجود ہوں اور درجنوں اہم شخصیات نے اپنے مفصل حالات قلم بند کیے ہوں،اس

کے بارے میں ایسی سرسری رائے دینا مناسب نہ تھا۔

معذرت خواہ ہوں کہ لکھنے پر آیا تو لکھتا ہی چلا گیا، یہ بھی نہ سوچا کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔

حواشی:

۱۔ افسوس صد افسوس کہ پچھلے ہفتے ان کا انتقال ہوگیا۔ کیسا نفیس انسان ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔ مجھے اُن سے نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ کراچی آتے اور اگر وقت ہوتا تو کسی ہوٹل میں ملاقات کے لیے وقت نکالتے۔ اکثر یہ ملاقات حمید نسیم مرحوم کے ساتھ ہوتی۔ ایک دو مرتبہ مشتاق احمد یوسفی صاحب بھی شریک محفل ہوئے۔ میں لاہور جاتا تو اُن سے ملاقات کی کوشش کرتا۔ آخری ملاقات اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کے دولت خانے پر ہوئی جہاں ڈاکٹر صاحب نے بہت سے کرم فرماؤں کو جمع کر رکھا تھا۔ اعجاز صاحب بیماری کے باوجود اس محفل میں موجود تھے۔ کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے۔

۲۔ جناب مصنف کا یہ بیان بھی قابلِ توجہ ہے:

> ''اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ زندگی بھر تم کس انسان سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تو میں بلا دریغ کہہ دوں گا کہ ناصرہ، اپنی رفیقۂ حیات سے'' [ص ۲۵۸]۔

''بلا دریغ'' کے استعمال کی معنی خیزی بھی قابلِ توجہ ہے۔